نقطۂ نظر

ڈاکٹر حافظ محمد مقصود

سائنس کی بے خدائیت میں مغربی سائنس دانوں کی علمی خیانت کا دخل

ایک تنقیدی جائزہ

روزِ آفرینش سے لے کر آج تک انسان دنیا، کائنات اور خود اپنے بارے میں سوچتا اور غور و فکر کرتا رہا ہے کہ وہ کہاں سے آیا؟ کیوں آیا اور بالآخر اُسے کدھر جانا ہے۔ ذوقِ تجسّس اور شوقِ جمال کے اس امتزاج کا اعتراف اقبالؔ نے ان الفاظ میں کیا ہے ؎

کُھلتا نہیں مرے سفرِ زندگی کا راز
سمجھا نہیں تسلسلِ شام و سحر کو میں
حیراں ہے بُوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں،
رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں

پھر یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اہلِ یونان نے کائنات کے اسرار و رموز اور فطرت کے اس ناپیدا کنار سمندر میں غوطہ زنی کی ایک مبارک مگر ناتمام کوشش کی تھی لیکن وہ چند پیچیدہ اور مبہم ڈھانچوں اور نامکمل ریاضیاتی نسبتوں کے علاوہ مزید پیش قدمی سے قاصر رہے۔ سائنسی فکر کو مشاہدات اور تجربات سے روشناس کرانے کا سہرا ایک دوسری اور اُبھرتی ہوئی قوم کے سر ہے جو ساتویں صدی عیسوی میں خطۂ عرب میں پروان چڑھی۔ یہ قوم ایک قادرِ مطلق خدا، ایک عظیم المرتبت رسول اور ایک عجیب و غریب کتاب قرآن مجید پر غیر متزلزل ایمان رکھتی تھی جن کی طرف سے انہیں مختلف پیرایوں میں بار بار یہ پاکیزہ تعلیم دی گئی تھی کہ اگر تم واقعی ایک بلند و بالا ہستی کی پہچان اور معرفت کے پیاسے ہو تو اُنہی کی پیدا کی ہوئی کائنات پر مسلسل غور و فکر کرتے رہو جس سے نہ صرف تمہیں خدائے واحد کی کبریائی اور جلالتِ شان کا سراغ مل جائے گا۔ بلکہ زندگی کی نئی نئی گرہیں خود بخود تمہارے سامنے کھل جائیں گی۔ چونکہ دنیا کے ان پہلے باقاعدہ سائنسدانوں کی سائنس خدا کی ترغیب و تحریص اور تشویق و تحریض سے شروع ہوئی تھی۔ لہٰذا خدا کا تصور ان کا مدار و محور رہا اور یہ اپنے فطری طریقے پر آگے بڑھتی رہی۔ اندلس مسلمان سائنس دانوں کا سب سے بڑا مرکز

تھا اور تشنگانِ علم دور دراز علاقوں سے آکر یہاں کے چشمۂ علم و فضل سے سیراب ہوتے تھے۔ یورپی سائنس جس نے آج سینکڑوں معموں کو روند ڈالا ہے اور ہزاروں حقائق کو بے نقاب کر دیا ہے۔ درحقیقت اندلس کے مسلمان سائنسدانوں ہی کی رہینِ احسان ہے۔ بلکہ اب تو جارج سارٹن اور رابرٹ بریفالٹ کی تحریروں سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح مبرہن ہو چکی ہے کہ سائنس کے پہلے بانی اور موجد مسلمان سائنسدان ہی تھے اور مغربی لٹریچر کا تانا بانا ان ہی کے ہاتھ کا کاتا ہوا ہے۔ رابرٹ بریفالٹ " (Intellectual Development of Europe. VOL. II P: 42) " میں تہذیب یورپ کے اس قبایہ راز کو ان الفاظ میں تار تار کر دیتا ہے کہ " مجھے افسوس ہے کہ جن اصولوں نے یورپی لٹریچر کو پیدا کیا، انہیں نظر انداز کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یورپ ذہنی لحاظ سے عربوں کا احسان مند ہے۔ قومی دشمنی اور مذہبی تعصب زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔" اسی طرح Heritage of Islam " P. 313 میں جارج سارٹن لکھتا ہے کہ " انسانیت کا مشن مسلمانوں ہی کے ذریعے مکمل ہوا۔ سب سے بڑا فلسفی الفارابی اور سب سے عظیم ریاضی دان ابو الکامل اور ابراہیم ابن سینا مسلمان تھے۔ سب سے بڑا جغرافیہ دان اور قاموس نگار المسعودی مسلمان تھا اور سب سے بڑا مؤرخ الطبری بھی مسلمان تھا"۔۔۔ راجر بیکن، گربرٹ آرک لیک، اور تھامس برن نے انہی اداروں میں تعلیم حاصل کی اور ریمنڈ (Raymond) نے یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر ۱۱۴۰ء میں فرانسیسی بندرگاہ مارسیلز میں سیاروں کی گردش کے بارے میں نقشے اور جدولیں تیار کیں۔ لیکن شومئ قسمت کہ حالات نے یکا یک ایک زبردست پلٹا کھایا اور خدا کی محبت سے سرشار دلِ درد مند اور فکرِ ارجمند رکھنے والی، حاملِ خلقِ عظیم اور صاحب صدق و یقین یہ عجیب و غریب قوم کسی کافر ادا محبوب کے حُبِّ جاہ جیسی غمزۂ خونریز کا شکار ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سے " ظالم جو بہہ رہا ہے وہ تیرا ہی گھر نہ ہو " اور سے " یہ سو رہیو نک کر تم سو گئے کہاں آخر" کے مصداق اپنے پیچھے آگ کی لپیٹ سے جلے ہوئے اور خاک و خون سے رنگے ہوئے بے ہنگم کھنڈرات چھوڑ کر تہذیب حجازی کا مزار بن کر رہ گئی۔

روئے اب دل کھول کر اے دیدہ خونابہ بار — وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرا نشینوں کا کبھی ! — بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے — بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
غلغلوں سے جن کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

اسی حادثۂ عظمیٰ اور مصیبتِ کبریٰ کے بعد تہذیب و تمدن کی کامرانیاں اور علم و عرفان کی اشرفیاں ان ظالم و جبار اہلِ مذہب کے ہاتھوں لٹیں جو ایک ایسے بے بنیاد مذہب کے پیروکار تھے جسے مشہور راہب سینٹ پال نے اصلِ دینِ عیسیٰؑ کو مسخ کر کے بنایا تھا۔ لیکن نادانی، حماقت اور سادہ لوحی کا بُرا ہو کہ لوگوں نے اسے اصلِ دینِ عیسوی سمجھا۔ حالانکہ سینٹ پال کی اس جدید عیسائیت یا "PAULISM" اور اصلی دینِ عیسیٰؑ کے مابین زمین و آسمان کا فرق تھا۔

ان مذہبی پرستاروں اور سرپرستوں کا بنیادی جاہلانہ اور کورانہ عقیدہ یہی تھا کہ دین اور دنیا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دین پاک و صاف ہے اور دنیا ناپاک و نجس۔ سائنس چونکہ دنیا سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا وہ بھی ناپاک ہے اور یوں سائنس کو اپنے مذہبی تصورات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خارج کر دیا۔ ان مردم آزار اور فطرت دشمن پادریوں اور راہبوں نے عقل و فکر پر مکمل پہرے بٹھا دیئے اور اپنے تحریف شدہ مذہب کے اوہام و خرافات کو لوگوں پر ٹھونسنا شروع کر دیا۔ جسے خوشنما بنانے اور اپنی دکان داری چمکانے کے لئے وہ جا بجا خدا اور عیسیٰؑ کے نام بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان پادریوں نے کلیسا کی گدی پر بیٹھ کر تین لاکھ بے گناہ لوگوں کو شدید ترین سزائیں دیں۔ جن میں تیس ہزار افراد کو زندہ جلا دیا گیا ان زندہ جلائے جانے والوں میں مشہور سائنسدان برونو (Brunoe) بھی شامل تھا جس کا سب سے بڑا جرم اور گناہ کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا۔ اسی طرح مشہور عالم طبیعات گیلیلیو (Galileo) کو اس لئے موت کی نیند سُلا دیا گیا کہ وہ سورج کے گرد زمین کی گردش کا بھی قائل تھا۔ اہلِ دانش و بینش سائنسدان اور معاشرے کے دوسرے ذہین و فطین افراد سوالیہ نشان اور مظلوم تماشائی بن کر ارباب کلیسا کے مظالم کی چکی میں نہایت بے دردی کے ساتھ پستے رہے اور ان کے دلوں میں ان کوڑھ مغز جہلائے مذہب اور کورچشم مبلغین کے خلاف غم و غصے کا ایک شدید لاوا پکتا رہا۔ اب ایسے مظلوموں کے سامنے صرف پالزم (Paulism) تو کیا کسی بھی مذہب کا نام آتا تو انہیں اچانک اپنے وہ بے گناہ محققین کہنہ مشق سائنسدان اور منجھے ہوئے فلسفی یاد آجاتے اور ان کی تڑپتی ہوئی لاشیں اُن کی آنکھوں میں پھر جاتیں۔ ساتھ ہی ساتھ مذہبی گروہ کے نام پر ان کی نگاہوں کے سامنے دیو ہیکل جسامتیں، پُرغضب اور منحوس چہرے، چڑھی ہوئی تیوریاں، بل پڑی ہوئی پیشانیاں، تنگ سینے، تاریک دل اور اوہام و خرافات سے لدے ہوئے دماغ آجاتے۔ ظالم اربابِ کلیسا اور حاملینِ عقل و فکر کے مابین یہ خونریز اور ناقابلِ تسخیر کشمکش تادیر جاری رہی جو بالآخر مذہبی کلیسا کی شکست اور مظلوم افراد کی شاندار فتح و کامرانی پہ منتج ہوئی۔

اور یوں ان علم دوست افراد (جن میں سائنسدان، فلسفی اور مفکرین سب شامل تھے) نے ایک ایک ظلم کا انتقام لے کر مذہبی کلیسا پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ ان کے تمام جاہلانہ اور کورانہ تصورات و نظریات کو کوڑے کرکٹ کی طرح ٹھوکر مار کر پھینک دیا گیا۔ اب وہ کلیسا کی ایک ایک فکر کو نکال کر نہایت ہی استحقار و استخفاف کے ساتھ اسے رد کر کے جھٹک دیتے تھے کہ اچانک خدا کا تصور بھی ان کے ہاتھ لگا اور ہاتھ لگتے ہی اِن حکمت و معقولات کے دعویدار سائنسدانوں سے ایک فاش اور دردناک غلطی صادر ہوئی۔ سائنس کی نیام کے اندر اللہ تعالےٰ کے تصور اور عشق و جنوں کی شکل میں جو تیغِ جگر دار پہلے ہی سے چلی آ رہی تھی ان عجلت پسند سائنسدانوں نے اچانک اڑالی اور یہ نیام آج تک خالی پڑی ہوئی ہے۔ سائنسدانوں کی اس فاش غلطی پر بیسویں صدی کا اقبالؔ ان الفاظ میں خون کے آنسو رویا۔

؎ عشق کی تیغِ جگر دار اڑالی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

انہوں نے مذہبی تعصب کی آگ میں جل کر اور خدا کے تصور کو کلیسا کی جاگیر سمجھ کر اسے بھی حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ گو کہ اس کا برملا اظہار انہوں نے نہیں کیا اور ایک بے بنیاد نظریہ گھڑ کر خدا کے تصور سے پیچھا چھڑانے کے لئے اسے سائنس کی درسی کتابوں میں شامل کر دیا گیا۔ جو آج تک ان کتابوں میں نہایت ہی فخر کے ساتھ پڑھا اور پڑھایا جا رہا ہے۔ اور اعلان کیا ہے کہ سچائی اور صداقت صرف وہی ہے جسے ہم براہ راست اپنے حواسِ خمسہ سے دریافت کر سکیں۔ جو چیز یا صداقت حواسِ خمسہ کی گرفت میں نہیں آتی وہ یا تو موجود ہی نہیں یا اگر ہے تو ہم اسے نہیں جان سکتے۔ اسی نظریئے کو حسّی صداقت کا نظریہ کہتے ہیں جس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ خدا کا تصور جو پہلے سائنس میں موجود ہی نہیں سائنس کا مدار و محور بھی تھا اب من مانی تاویلوں کے ذریعے سائنس سے خارج کر دیا جائے۔

کیا حسّی صداقت کا نظریہ حقیقت پر مبنی ہے! تاریخ گواہ ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ حسّی صداقت کا نظریہ کسی خداداد عقل، کسی نُدرتِ فکر یا کسی وسعتِ علم کا کرشمہ نہیں بلکہ سینٹ پال کی گھڑی ہوئی نام نہاد شریعت، Paulism، اور سائنس دانوں کی کشمکش کا نتیجہ تھا۔ اگر یہ حسّی مفروضہ صحیح ہے تو ہم اسے سچائی اور صداقت ہرگز نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ بہرحال ایک مفروضہ ہے۔ جسے کسی سائنسدان نے سائنسی طریقوں یا براہِ راست حواسِ خمسہ سے دریافت نہیں کیا بلکہ ایک سوچ یا اختراع ہے۔ مغربی سائنسدان اس مفروضہ سے یہ خلاصہ نکالتے ہیں کہ سائنس کو کسی ایسے عقیدہ سے شروع نہیں ہونا چاہیئے جو براہِ راست حواسِ خمسہ سے ثابت اور دریافت شدہ نہ ہو۔

لیکن ان کا یہ انوکھا اور نرالا اصول بجائے خود ایک عقیدہ یا خیال ہے جو حواسِ خمسہ سے ثابت شدہ نہیں کیونکہ جب ایک مغربی سائنسدان کسی سائنسی عمل کو شروع کرتا ہے تو وہ صرف عمل نہیں ہوتا بلکہ عمل کے وجود یا ظہور سے پہلے اس عمل کے بارے میں ایک خیال یا عقیدہ اُن کے دماغ میں موجود ہوتا ہے۔ اور عقیدہ کے بعد سائنسی عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ سائنس دان کے ذہن میں جو چیز پہلے وجود یا ظہور میں آتی ہے وہ عقیدہ ہے۔ اور جو چیز عقیدہ کے بطن سے بعد میں پیدا ہوتی ہے وہ سائنسی عمل ہے۔ لیکن عقیدہ جس نے سائنسی عمل کو ممکن بنایا بجائے خود حواسِ خمسہ سے ثابت شدہ نہیں۔ لہٰذا مغربی سائنسدان اسے تسلیم کرنے کو بھی تیار نہیں اور جب انہوں نے عقیدے کی نفی کی تو عقیدے سے پیدا ہونے والا سائنسی عمل بھی ناممکن اور بے بنیاد ہو کر رہ جائے گا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جب مغربی سائنسدان اپنی سائنس کو اس عقیدہ سے شروع کرتا ہے کہ سائنسی عمل کو کسی عقیدہ سے شروع نہیں ہونا چاہیئے تو واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی تردید اور مخالفت خود کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مغربی سائنسدان اس بات پر مجبور ہے کہ سائنسی عمل کا آغاز ایک ایسے عقیدہ ہی سے کرے جو براہِ راست حواسِ خمسہ سے ثابت شدہ نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسانی فطرتاً محبت و موانست کا ایک جذبہ اور اظہار ہے اور محبت کسی چیز کے حسین و جمیل ہونے کے عقیدے کا دوسرا نام ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کا کوئی عمل ایسا بھی ہو جس سے پہلے ایک عقیدہ موجود نہ ہو۔ سائنسی عمل بھی چونکہ ایک انسانی فعل ہے لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ مغرب کا سائنسدان عقیدہ کے بغیر سائنسی عمل کا آغاز کر سکے۔

یہاں پر سوال کرنے والا سوال کر سکتا ہے کہ اگر حسی صداقت کا یہ نظریہ بجائے خود سائنسی طریقوں سے ثابت شدہ نہیں تو پھر اس کی علمی اور عقلی دلیل کیا ہے؟ نہایت افسوس کی بات تو یہی ہے کہ اسکی علمی اور عقلی بنیاد کوئی نہیں بلکہ درحقیقت یہ ایک سازش اور گٹھ جوڑ کا نتیجہ تھا جس کا مقصد سائنس کو اسی راستے سے بچانا تھا جو اللہ تعالےٰ کے تصوّر کی طرف جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پھر بعد میں، خدا ناشناس فلسفیوں نے جب بے خدا ذہنیت کے ساتھ خدا ناآشنا فلسفوں کو رواج دیا اور فطرتِ انسانی کی روحانی اور آفاقی نصب العین کی گمراہ کُن توضیحات پیش کی گئیں، جب سگمنڈ فرائڈ نے غلطی سے اس کی جنسی تعبیر کر ڈالی۔ جب ایڈلر نے نادانی اور حماقت سے اسے قوّت یا غلبہ حاصل کرنے کی خواہش کا جذبہ قرار دیا، جسے میکڈوگل نے دھوکہ کھا کر انسان کی حیوانی خواہشات کے ایک پُراسرار مرکّب کا جذبہ سمجھا، جبکہ ڈارون نے اسے قدرت کی بے مقصد کارروائیوں کا نام دیا اور جب کہ

کارل مارکس نے اسے بغیر کسی محکم دلیل کے، انسان کی اقتصادی ضروریات کی ایک بگڑی ہوئی شکل فرض کرلیا ـــــــ تو رفتہ رفتہ لوگ بھی اُن تاریخی صداقتوں کو بھول گئے اور انہوں نے یقین کرلیا کہ گویا کائنات کا پیدا کرنے والا کوئی خدا نہیں اور یہ سارا کارخانہ یونہی خود بخود چل رہا ہے۔

سچائی اور صداقت صرف وہی نہیں جسے ہم براہِ راست حواسِ خمسہ سے دریافت کرسکیں۔ بلکہ وہ بھی ہے جسے ہم براہِ راست مشاہدہ سے تو معلوم نہ کرسکیں لیکن کائنات کے اندر اس کے آثار ونتائج کو براہِ راست مشاہدہ سے معلوم کرسکیں۔ مثال کے طور پر ایٹم ہی کو لیجئے۔ ہیروشیما کی تباہی تک ایٹم کو کسی سائنسدان نے خوردبین سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے باوجود ایٹم کے آثار اور نتائج کو دیکھ کر تمام سائنسدان اس کے اوصاف اور خصوصیات کا یقین کرتے تھے۔ خدا کو بھی ہم براہِ راست نہیں دیکھ سکتے لیکن کائنات کے اندر اس کے ظاہر و آشکار آثار ونتائج کو دیکھ کر ہم اس کے وجود کا یقین کرتے ہیں۔ اگر مغرب کے سائنسدان ایٹم اور ایکس ریز کے آثار ونتائج کی بنا پر اسے سائنسی حقیقت سمجھتے ہیں تو یہ کون سی ستم ظریفی ہے کہ کائنات میں خدا کے آثار ونتائج کی بنا پر خدا کو ایک سائنسی حقیقت نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ حسی صداقت کا وہی بے بنیاد مفروضہ، کلیسا کی وہی دیرینہ دشمنی اور خدا کے تصور سے وہی پرانا ڈر ہے جسے کلیسا کی جہالت اور سائنسدانوں کی علمی خیانت نے جنم دیا تھا۔ ایک سائنسدان قدرت کا مطالعہ اور مشاہدہ کرکے جب اس کے اندر نظم (ORDER) دریافت کرتا ہے تو اس کی یہ تحقیق خود بخود اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا کرتی ہے کہ یہ سب کچھ کون سے ذہن کی پیداوار ہے؟ جس نے کائنات کے اندر باقاعدگی، مقصدیت، تسلسل، کمال اور جمال جیسی خوبیوں کو پیدا کیا ہے۔ اس سوال کا علمی اور عقلی جواب اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ ایک ایسی قادرِ مطلق ہستی ضرور موجود ہے جس کی عظمت و کبریائی کے راگ کائنات کے گوشے گوشے میں چار و ناچار الاپے جا رہے ہیں اور جس کے جلال وجمال کی جھلکیاں ذرّے ذرّے میں عیاں ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایک ہی حالات کے تحت اُس خالقِ کائنات کا پیدا کردہ نظم (ORDER) ہر جگہ یکساں ہے۔ مثلاً تنفس، انجذاب اور انہضام کا عمل سارے انسانوں کے اندر ایک ہی طریقے سے تکمیل پاتا ہے۔ کششِ ثقل کا عمل جہاں بھی ہوتا ہے ایک ہی قاعدے کا پابند ہے۔ دنیا کے ایک کونے میں اگر انسانی ذہن سوچنے کا کام کرتا ہے تو یہ بات خالقِ ارض وسماء کی پیدا کردہ نظم کے خلاف ہے۔ کہ کسی دوسرے کونے میں وہی ذہن کھانے پینے یا ہنسنے اور کھیلنے کا کام سرانجام دے۔ بلکہ یہ ذہن سوچنے ہی کا کام کرے گا۔ اور پھر جب یہ کائناتی نظم ہر جگہ ایک ہی ہے تو لازماً تسلیم کرنا پڑے گا اُ

علم و عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ خالق کائنات دو تین یا چار نہیں بلکہ صرف اور صرف ایک ہی ہو لیکن افسوس ہے کہ مغربی سائنسدان کو یہ ظاہر و آشکار حقیقت باور کرانے کے لئے کہاں سے دماغ لائے جائیں ؟ ذرا دیکھو تو سہی علم و عقل پر پردہ ڈالنے والے ایسے سائنسدانوں اور فلسفیوں کا قرآن نے اس انداز میں تعاقب کیا ہے کہ :

وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ○ (سورۃ یوسف : آیت : ۱۰۵)

اور زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر یہ لوگ بغیر توجہ دیئے ہوئے جان بوجھ کر گزر جاتے ہیں ۔

پھر جب ایک مغربی سائنسدان سائنس کی درسی کتاب لکھنے بیٹھتا ہے اور فارمولے اور کلیات کو ثبت قرطاس کر کے دوبارہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جسے اقبال مرحوم جوشِ جنوں اور سوز دروں کے ساتھ مقامِ فکر اور ذکر سے تعبیر کرتا ہے تو نظم اور آرڈر کے حوالے سے ایک بار پھر اس کے ذہن میں یہ سوال آجاتا ہے اور غیر شعوری طور پر سوز و مستی اور جذب و شوق کا ایک سیلاب اس کے اندر ہی اندر ٹھاٹھیں مارنا شروع کر دیتا ہے کہ بتاؤ تو سہی یہ کونسا ذہن ہے اور یہ کس کی گل کاری ہے جو کائنات کے ذرّے ذرّے میں آشکار ہے ؟ لیکن مغرب کا سائنسدان جستجوئے حق کے بجائے چور دروازوں کی تلاش میں لگ جاتا ہے ۔ جوں جوں یہ سوال آگے آتا ہے مغرب کا سائنسدان اتنا ہی پیچھے جاتا ہے اور ہر ممکن طریقے سے اس سوال سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کا جواب اس کی درسی کتاب میں نہ آنے پائے ۔ وہ یا تو اس سوال کا نوٹس ہی نہیں لیتا یا اگر لیتا ہے تو بعض سائنسدان اور فلسفی بہت دور کی کوڑیاں لا کر اصل تصوّرِ خدا کی جگہ چند ادھورے تصوّرات کو رکھ دیتے ہیں ۔ مثلاً برگساں اسے کسی "قوّتِ حیات" کا نام دیتا ہے ۔ جیمز جینز اسے " ریاضیاتی ذہن " سمجھتا ہے اور ڈریش کسی "عالمی سکیم" یا " انٹی لیچی " کا راگ الاپتا ہے ۔ لیکن ایسے لنگڑے اور لولے تصوّرات تعصب اور خیانت کی دنیا میں تریاق اور آبِ حیات ہوں تو ہوں علم اور عقل کی فضا میں پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے ۔

صرف یہی نہیں بلکہ جب دنیائے مغرب نے اہلِ مشرق کو بھی اپنے غلامی کے پنجۂ استبداد میں کس لیا تو قلب و نظر کی رنجوری نے یہاں کی فضا کو بھی مسموم کر کے رکھ دیا ۔ مشرق کے پرانے مٹکے اور مغرب کے بلّوری کنٹر نے اہلِ مشرق کو احساسِ کمتری کے ایک ایسے روگ میں مبتلا کر دیا کہ انہوں نے بھی ہستی اسداقت کا بے بنیاد مفروضہ جوں کا توں لے کر اپنی کتابوں میں شامل کر دیا اور ایک ایسے

نام نہاد مسلمان معاشرے کو فروغ دیا جس میں شرم وحیا سے عاری اور بے خدا گلوکار، اداکار، فنکار اور موسیقار تو سینکڑوں پیدا ہوئے لیکن خدائے واحد کا پجاری اور دنیا کو سنوارنے والا جگت سدھار چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی مل نہ سکا۔

لہٰذا سائنس کا بے خدا ہونا کوئی معمولی اور بے ضرر سی تبدیلی نہیں جو صرف کتابوں، پمفلٹوں اور رسالوں ہی کے اندر رہی۔ بلکہ اسی حادثۂ فاجعہ نے کتابوں سے بڑھ کر ایک بے خدا ذہنیت رکھنے والی انسانیت کو جنم دیا۔ انسان اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ جو کچھ سوچتا ہے اس کے اعضاء و جوارح سے وہی کچھ سرزد ہوتا ہے۔ اس کے خیالات اور نظریات بے خدا ہوں تو اس کے اعمال کا بے خدا ہونا ضروری ہے۔ اسی کی وجہ سے اب کوئی ایسی وسیع اور ہمہ گیر اخلاقی اور روحانی قوت دنیا میں باقی نہیں رہی جو انسانی ضمیروں کے اندر پولیس چوکیاں بن کر اندر سے اُن کے اعمال کو ضبط میں لا سکے۔ یہی واقعہ ہے جو دورِ حاضر کی تمام سیہ کاریوں اور فتنہ سامانیوں کا واحد سبب ہے۔ مثلاً عظیم جنگوں کا ایک لا متناہی سلسلہ جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ انسانی گوشت نوچنے والی جدید ہتھیاروں کے بڑھتے ہوئے انبار، عیّار سیاست کاروں اور نادان فلسفیوں کے جھوٹ اور فریب، سیاسی انقلابات اور ان کے بطن سے پیدا ہونے والے خفیہ قتل اور وارداتیں، سڑکوں اور شاہراہوں پہ پھسلتی، گھسٹتی اور ایڑیاں رگڑتی ہوئی بے گناہ انسانی لاشوں کی بھرمار، جہازوں سے گرتے ہوئے بم اور توپوں، ٹینکوں اور بندوقوں سے زہر آلود گولیوں کی نکلتی ہوئی باڑیں، دولت کی فراوانی کے باوجود اطمینانِ قلب کا فقدان، جنسی بیماریوں، خودکشیوں اور سنگین جرائم میں مبتلا انسانوں کا طومار اور ہسپتالوں، دواخانوں اور شفاخانوں کے اندر ایسے ذہنی اور جسمانی مریضوں کا دھکم پیل اور جمِ غفیر دھاڑ، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اندر طلباء کی بے راہ روی اور بے مقصدیت پہ مبنی اشتغال، مہذب ممالک کا ایک دوسرے کے ساتھ معاملات میں فریب، دھوکہ دہی اور چالبازی کا استعمال، اور بے سروپا اور غلط پروپیگنڈوں کا اچھلتا ہوا طوفان، بڑی بڑی عدالتوں میں جھوٹ، بے انصافی اور چور بازاری کا بڑھتا ہوا رجحان، نوجوانوں کے اندر ذہنی بے سکونی کی بدولت اخلاق سوز حیوانی اور نفسانی ہیجانات، فوجی جیلوں کے اندر بے گناہ انسانوں پہ ڈھائے ہوئے لرزہ خیز مظالم اور ان پر تھوپے ہوئے بے بنیاد الزامات اسمبلیوں، ایوانوں اور پارلیمنٹ ہاؤس کے اندر انسانی شکل میں متشکل اور انسانی کپڑوں میں ملبوس خونخوار درندوں اور بھوکے بھیڑیوں کی پیدا کردہ انتشار، سرخیوں، پاؤڈروں اور آئنوں کے ذریعے ظاہری بناؤ سنگار، جبکہ اندر ہی اندر بھلائی، اخلاق، شرافت اور انسانیت کا انحطاط، سیاسی حریفوں

کے اغوار کی سینکڑوں وارداتیں اور ان پر کئے گئے بے پناہ ظلم و تشدد کے روح فرسا واقعات ، علم کتاب اور استاد کے احترام کا زوال اور علمی درسگاہوں کے نظم و نسق کا بگاڑ۔ فحاشی و عریانی اور بدنی خواہشات کو ابھارنے والی فلموں اور سینما گھروں کے بچھے ہوئے جال۔ مادہ پرست تہذیب کے دلدادہ بیٹوں کے ہاتھوں سکتے ہوئے بدقسمت والدین کا اپنے گھروں سے اخراج اور روح و بدن کے اس فیصلہ کن معرکے میں تہذیبی درندوں کی یلغار وغیرہ وغیرہ

ے دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

عزیز ساتھیو! آپ نے دیکھ لیا کہ حیّت زدہ تہذیب کی گاڑی کتنی سُرعت اور تیز رفتاری کیساتھ قلابازیاں کھاتی ہوئی عظیم بلندیوں سے اتھاہ گہرائیوں کی جانب لڑھک رہی ہے۔ ایک ایسے نازک وقت میں اگر اس کے چلانے والے نادان فلسفیوں اور بے خدا سائنسدانوں کو بالجبر روکا نہیں گیا تو مسافر تو پھر بھی مسافر ہیں گاڑی کے ٹھوس پُرزے بھی ریزہ ریزہ ہونے سے بچ نہیں سکتے۔ بلکہ اب تو ے " تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں " کے مصداق اس کی تیاری سپر پاورز کے ایٹم بموں کی شکل میں ' اور مستقبل قریب میں چند دوسرے بموں کی شکل میں دیکھتی آنکھیں دیکھ لیں گی محترم دوستو! میں صاف صاف کہتا ہوں کہ انسانیت کے لئے بھلائی کے دور دور تک بھی آثار نہیں بھلائی اگر ہوگی تو اُن بے غرض اور قرآن و سنّت کے علم و عمل سے مزین نوجوانوں کے ہاتھوں ہوگی جو آج اللہ تعالےٰ کے حضور گڑگڑا کر اپنے گناہوں سے توبہ اور استغفار کی منادی لے کر اُٹھ کھڑے ہوں جو انسانیت کو عالمگیر اصولوں کی حامل اور خدا کے تصور پر مبنی فلسفہ پڑھائے اور فطرت کا مطالعہ کرتے ہوئے فکر و استدلال کی ان درمیانی کڑیوں کو نظر انداز نہ کر دے جنہیں نظر انداز کرتے ہوئے مغربی اہل نظر ایک جبلّی ضد ایک پرانی چڑ اور ایک دیرینہ تعصب میں مبتلا ہیں۔

عزیز دوستو! آپ میرا نقطۂ نظر سمجھنے میں غلطی نہ کریں۔ میری مراد چند واعظوں کی تیاری نہیں جو کتاب اللہ کی چند چھوٹی موٹی آیات رٹ کر دیہات میں محض وعظ و نصیحت کر سکے۔ نہیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے اندر سے ایسے باہمّت ' باحوصلہ اور خدا پرست نوجوان اٹھ کھڑے ہوں جو حکمتِ قرآنی کے محکم اساسات اور اسلام کے عالمگیر فلسفے کو پورے استدلال کے ساتھ آکسفورڈ اور کیمبرج میں بھی پیش کر سکیں۔

پیارے دوستو! میں پھر کہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے نہ صرف تمہیں جوانی کی قوتوں سے نوازا

ہے بلکہ تمہیں کریم آف دی نیشن بھی بنایا ہے۔ کل اگر خدا کی عدالت میں پوچھا گیا کہ جب روحانیت اور فحاشیت کے مابین ایک طویل رسّہ کشی، ایک خوں ریز کشمکش اور ایک فیصلہ کن معرکہ برپا تھا اس وقت تمہارا وزن کس پلڑے میں جا کر گر رہا تھا؟ روحانیت کے پلڑے میں یا فی الواقع فحاشیت کے پلڑے میں؟ کیا جب بے خدا فلسفی اور سائنسدان نادانی سے آئندہ نسلوں کی تباہی اور بربادی کا سامان کر رہے تھے تو پُر تشنب ہونے کی بجائے تمہارے چہروں پر شرمیلی مسکراہٹیں ہی آتی رہیں۔ جب گمراہی اور ضلالت کے فلسفے انسانیت کی سربراہی کر رہے تھے تو تم صرف جیب اور پیٹ کے شغلوں اور ہمہموں میں مستغرق ہو کر خاموش تماشائیوں کی طرح تماشا ہی کرتے رہے؟ جب تمہارے سامنے خدائیت اور روحانیت کا خون ہو رہا تھا تو تم اس کا راستہ روکنے کی بجائے تالیاں ہی پیٹتے رہے۔ اور جب درندگی کی علمبردار قوتیں مسلح ہو کر جنگ کے میدان میں اتر چکی تھیں تو تم کھیل کے خالی میدانوں میں تن کر کمزوروں کو ہی اپنا بانکپن دکھاتے رہے؛

پس مستقبل کا عالمگیر انقلاب اور انسانیت کا نجات دہندہ سائنس اور خدا کے تصوّر کے ملاپ ہی سے ممکن ہے۔ اسی ضمن میں نامور مفکر پٹی رم سارو کن (Pitrum Sorokin) جو امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں سوشیالوجی کے پروفیسر بھی رہ چکے ہیں، اپنی کتاب The crises of our age میں لکھتا ہے:

> "مذہب اور سائنس کی موجودہ تفریق حد درجہ تباہ کن ہی نہیں بلکہ غیر ضروری بھی ہے۔ اگر سچی صداقت اور سچی نیکی کے معقول اور تسلی بخش نظریہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو مذہب اور سائنس دونوں ایک ہی ہیں اور ایک ہی مقصد پورا کرتے ہیں۔ وہ مقصد یہ ہے کہ قادرِ مطلق خدا کی صفات کو اس مرئی دنیا کے اندر ظاہر کیا جائے تاکہ خدا کے نام کا بول بالا ہو اور انسان کی عظمت پایۂ ثبوت کو پہنچے"۔

ایک دوسرے فلسفی فیلڈ مارشل سمٹس نے "ہولزم" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ لکھتا ہے:

> 'یہ کہنا قرینِ انصاف ہوگا کہ سائنس ہمارے اس زمانہ کے لوگوں کے لئے شاید خدا کی ہستی کا سب سے بڑا انکشاف ہے۔ یقیناً مستقبل میں نوعِ انسانی کے لئے کرنے کے بڑے بڑے کاموں میں سے ایک یہ ہوگا کہ وہ سائنس کو اخلاقی قدروں کے ساتھ جوڑے اور اس طرح اس مہیب خطرے کا سدِّباب کرے جو ہماری تہذیب کے

(باقی صفحہ ۴۲ پر)